

تحقیق و تنقید

فن حدیث میں منہاج تحقیق

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی

قرآن کے بعد حدیث اسلامی شریعت کا دوسرا بنیادی ماخذ اور اسلامی تہذیب کا تفصیلی سرچشمہ ہے۔ حدیث کتاب اللہ کی تشریح و تفسیر کے ساتھ اپنا مستقل تشریحی مقام رکھتی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر حدیث میں تحقیقی کام کا رجحان اور میدان وسیع رہا ہے۔ محدثین نے نقد حدیث کے جو اصول وضع کیے اور ان کے ساتھ فن اسما و الرجال کو جو ترقی دی وہ دوسرے شعبہ علم کے طریقہ تحقیق میں بھی رہنما اصول کا درجہ رکھتے ہیں۔ حدیث میں تنقید و تحقیق کا طریقہ آج بھی نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے اور جدید زمانہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تاریخی تنقید بھی مشکل ہی سے اس پر کوئی اضافہ کر سکتی ہے۔ بقول ایک محقق کے ”محدثین کے اصول تنقید اپنے اندر ایسی نزاکتیں اور باریکیاں رکھتے ہیں جن تک موجودہ زمانے کے ناقدین کا ذہن بھی ابھی تک نہیں پہنچا ہے، نیز دنیا میں صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و میراث اور ان کے دور کی تاریخ کا ریکارڈ ہی ایسا ہے جو اس کڑی تنقید کے معیاروں پر کسا جانا برداشت کر سکتا تھا جو محدثین نے اختیار کی ہے“۔

ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی یہاں تک کہتے ہیں ”محدثین ہی نے دنیا کی ساری قوموں کے مقابلے میں سب سے پہلے اخبار و روایات کی علمی تحقیق و تنقید کے قواعد و ضوابط مقرر کیے“۔

۱۔ مولانا مودودی، سنت کی آئینی حیثیت ص ۵۹ طبع لاہور ۱۹۸۴ء

۲۔ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی، السنۃ و مکانتہا فی التشريع الاسلامی ص ۱۰ طبع قاہرہ ۱۳۸۰ھ

قرآن بنیاد تحقیق ہے

اس طریقہ تحقیق کی بنیاد خود قرآن کریم نے فراہم کی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
جاءكم فاسق نبياً فتبينوا
تصيبوا قوماً بجهالة فتصبوا
على ما فعلتم ندمين
اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر کوئی
فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر
آئے تو تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ
تم کسی گروہ کو نادانانہ نقصان پہنچا بیٹھو
(الحجرات: ۶) اور پھر اپنے کیے پر شیمان ہو۔

اس آیت میں تحقیق کا حکم خبر اور خبر لانے والے دونوں سے متعلق ہے اور یہیں سے فنِ حدیث میں روایت اور درایت کے اصول یعنی حدیث کی سند اور متن کی تحقیق میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ نیز قرآن کریم کی حسب ذیل آیت بھی اسلامی تحقیق کے منہاج کو متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔

واذا جاءهم امر من
الامم او الخوف
اذا عواويل و لور دوة الى
الرسول والى اولى الامر
منهم لعلمه الذين
ليستنبطونه منهم
يہ لوگ جہاں کوئی اطمینان بخش
یا خوف ناک خبر سن پاتے ہیں اسے
لے کر پھیلا دیتے ہیں حالانکہ اگر یہ اسے
رسول یا اپنی جماعت کے ذمہ دار اصحاب
نہیں پہنچائیں تو وہ ایسے لوگوں کے علم
میں آجائے جو ان کے درمیان اس بات
کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ اس سے صحیح
نتیجہ اخذ کر سکیں۔
(النساء: ۵۸)

قرآن چونکہ اندھی عقیدت اور تقلید جامد کا مخالف ہے اس لیے وہ تحقیق و تنقید اور حق شناسی کو صحت مند اور متحرک علمی زندگی کے لیے لازم قرار دیتا ہے بلکہ عقیدہ جیسے نازک مسائل کو بھی عقل و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے کی دعوت دیتا ہے۔

حدیث بھی بنیاد تحقیق ہے

حدیث کی تحقیق و تنقید اور چھان بین کی روایت کو فروغ دینے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو بڑا دخل ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر ایک طرف حدیث کو یاد کرنے اور اس کی حفاظت و اشاعت کی فضیلت بیان فرمائی اور ایسے لوگوں کے لیے جو اس مقدس علمی کام میں اپنا وقت لگائیں دعائیں دیں اور خوشخبریاں سنائیں تو دوسری طرف اپنی طرف کوئی بھوٹی بات منسوب کرنے پر سخت وعید بھی سنائی۔ آپ نے فرمایا:

من كذب عليّ
متعمداً فليتبوأ مقعده
من النار
جس نے جان بوجھ کر میری جانب
کوئی بھوٹی بات منسوب کی اس کا ٹھکانہ
جہنم ہے۔

چونکہ آپ کا معاملہ عام انسانوں سے مختلف ہے یاں معنی کہ آپ کی ہر بات اپنا اثر بنی وزن رکھتی ہے اور آپ کی سنت سرچشمہ ہدایت اور اساس دین ہے اس لیے کوئی بات آپ کی طرف کبھی ایسی منسوب نہیں ہونی چاہیے جو آپ نے نہیں کہی ورنہ دین کے نام پر بے دینی کی اشاعت عمل میں آئے گی چنانچہ آپ نے خود ہی فرمایا:

ان كذبوا علىّ ليس
ككذب عليّ احد من
كذب عليّ متعمداً
فليتبوأ مقعده من
النار
میری جانب کوئی بھوٹی بات منسوب
کرنا ایسا نہیں جیسے کسی عام شخص کی
جانب کوئی بھوٹی بات منسوب کر دی
جائے۔ جس نے جان بوجھ کر میری جانب
کوئی بھوٹی بات منسوب کی اس کا
ٹھکانہ جہنم ہے۔

اس کے نتیجے میں محدثین اور اصولیین حدیث کے قبول و اشاعت کے معاملے میں نہایت حساس اور محتاط ہو گئے اور پھر انھوں نے صحت و سقم کو پرکھنے کے

لہ بخاری و مسلم

لہ مسلم مقدمہ باب تغلیط الکذب علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

لیے ایسی کسوٹیاں بنائیں کہ عام انسانی تاریخ اور علوم و فنون کے معیار سے ہزار ہا درجہ سخت اور بدن کہی جاسکتی ہیں۔ اور یہ علمی تحقیق کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔

صحابہ کرام نے اس طریقہ تحقیق کو اپنایا

صحابہ کرام جنہوں نے حالت ایمان میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا اور اسی پر ان کا انتقال ہوا۔ ہمارے نزدیک امت کے بہترین لوگ ہیں اور وہ صادق و عادل ہیں وہ اپنے باہمی معاملات میں جھوٹ نہیں بولتے تھے جن میں نفع و نقصان کا پہلو ہوتا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں تو وہ گویا ہلاک ہونا زیادہ پسند کرتے بجائے اس کے کہ کوئی جھوٹی بات آپ کی طرف منسوب کریں۔ چنانچہ حضرت علی فرماتے ہیں ”میں جب تم لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کروں تو مجھے آسمان سے گرجانا پسند ہے مگر آپ کی طرف جھوٹ کا انتساب پسند نہیں ہے۔ مگر جھوٹ اور غلط بیانی سے احتیاط کرنے کے باوجود اس بات کا پورا اقبال موجود ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث سننے میں، مفہوم کو سمجھنے میں یا موقع و محل کو متعین کرنے میں کسی صحابی کو غلط فہمی ہوگئی ہو اس لیے یہاں تحقیق کے دونوں اصولوں روایت اور درایت سے کام لیا گیا مثال کے طور پر حضرت ابو ہریرہؓ نے نبی کریمؐ کے حوالے سے بیان کیا کہ گھر، عورت اور سواری میں نحوست اور بدبختی پائی جاتی ہے۔ یہ بات جب حضرت عائشہؓ کو معلوم ہوئی تو انہوں نے کہا ابو ہریرہؓ نے پوری بات نہیں سنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہودی لعنت کر رہے تھے کہ وہ عورت، گھر اور سواری میں بدبختی کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ ابو ہریرہؓ نے پوری بات نہیں سنی اور آخری جملہ کو آپ کا قول بتا دیا۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی عدالت و ثقاہت میں کوئی کلام نہیں مگر انہوں نے

۱۔ بخاری، کتاب المناقب

۲۔ مسند ابوداؤد الطیالسی، مسند عائشہ۔
۳۳۱

غلط فہمی کی بنیاد پر یہود کے عقیدہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بتا دیا حضرت عمرؓ سے حضرت فاطمہ بنت قیسؓ نے کہا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نفقہ اور سکنی کا حکم نہیں دیا حضرت عمرؓ نے فرمایا: میں ایک عورت کی وجہ سے کلام اللہ اور سنت رسول اللہ نہیں چھوڑ سکتا، کیا پتہ اس نے اس کو صحیح طریقہ سے محفوظ رکھایا بھول گئی۔

خلفاء اربعہ حدیث بیان کرنے والوں سے شہادت اور قسم اس لیے طلب کرتے تھے کہ حدیث کی قطعیت پائیدار ہو تک پہنچ جائے۔ اس طرح کی مناسبتیں بتاتی ہیں کہ خود صحابہ نے علم کے طریقہ تحقیق کو نہ صرف اپنایا بلکہ حدیث کے اخذ و قبول میں اسے پوری طرح لاگو کیا۔

روایت اور درایت

حدیث کی تحقیق و تنقید کے لیے عام طور پر دو قسم کے طریقہ کار وضع کیے گئے۔ پہلا طریقہ تحقیق روایت ہے۔ یہ طریقہ تحقیق زیادہ عام اور مشہور رہا ہے اور حدیث کی تحقیق میں زیادہ تر اسی سے کام لیا گیا ہے، اس میں حدیث کے اصول، جرح و تعدیل اسماء الرجال، علل اسناد، راوی کی اخلاقی و دینی حالت، حفظ و ضبط، عدالت و ثقاہت اعتقادی و فکری کی کیفیت وغیرہ سے بحث کی جاتی ہے۔ اس اصول تحقیق کی رو سے حدیث کے دو بنیادی اقسام کیے گئے ہیں متواتر اور احاد۔ متواتر وہ احادیث ہیں جن کے راوی ہر دور میں اتنی تعداد میں رہے ہوں کہ ان سب کا کسی غلط بات پر اتفاق کرنا مشکل ہو، حدیث متواتر میں اگر قوی روایات کو لیا جائے تو ایسی احادیث بہت کم ہیں لیکن اگر علمی روایات یعنی تعامل و توارث کو لیا جائے تو احادیث کا بڑا حصہ متواتر کہلانے کا مستحق ہے چنانچہ مولانا مناظر حسن گیلانی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ:

”تاریخ کے اس عظیم الشان ذخیرہ کے ایک بڑے حصے کو میں متواتر خیال کرتا ہوں یعنی بغیر کسی انقطاع کے لاکھوں اور لاکھوں کے بعد کر دیا

کر دینا ان لوگوں کے ذریعے سے مشرق و مغرب میں یہ حصہ منتقل ہوتا ہوا دنیا کے موجودہ دور تک پہنچا ہے اور ان شاء اللہ تعالیٰ قیامت تک پہنچتا رہے گا۔ طہارت و غسل، وضو، عبادات، نماز، روزہ حج، زکوٰۃ، معاملات، عقوبات، سیاسیات، مباحات و محظورات وغیرہ مختلف ابواب کے ان اتفاقی مسائل کا اگر انتخاب کیا جائے جو عہد نبوت سے اس وقت تک ہر ملک اور ہر فرقہ کے مسلمانوں میں طبقہ بعد طبقہ، خلفا عن سلف تواتر کے ساتھ اس حقیقت سے مسلم ہیں کہ یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور طرز عمل تھا تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان کی تعداد ہزاروں سے متجاوز نہ ہوگی۔ یہ خیر و احسن کے رواۃ متواتر سے کم ہوں محدثین کے اصول تحقیق و تنقید اور بحث و تمحیص کا زیادہ تر موضوع رہی ہے اس کی تین قسمیں ہیں۔ مشہور، عزیز اور غریب۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

علم الاسناد۔ بیعت	علم الاسناد وہ علم ہے جس میں
فیہ عن صحۃ الحدیث	حدیث کی صحت و ضعف کی تحقیق
وضعه لیعمل بہ او یرک	کی جاتی ہے۔ راویوں کے حالات
بہ من حیث صفات	معلوم کیے جاتے ہیں اور متن حدیث
الرجال وصیغ الاداء والعتوات	میں غور کیا جاتا ہے۔ تاکر یہ واضح
لا یبحث عن رجالہ بل	ہو سکے کہ حدیث واجب العمل
یحال العمل بہ من غیر بحث	ہے یا لائق ترک۔

اور اس کے لیے علم الاسناد، اسماء الرجال روایت کی اقسام، صحیح، حسن، ضعیف، مقبول، مضطرب، مدرس، موضوع وغیرہ کے ذیلی اصول و جود میں آئے یہ بات مسلم ہے کہ کسی بات کا وزن بیان کرنے والے کی شخصیت سے متعین ہوتا ہے اس

۱۔ مولانا مناظر احسن گیلانی، تدوین حدیث ص ۵۳ طبع کراچی ۱۹۵۶ء

۲۔ ابن حجر، نزہۃ النظر فی توضیح نخبہ الفکر ص ۱۱ طبع دہلی ۱۹۰۲ء

لیے اسناد کے اصول کو حدیث کی تحقیق کے سلسلہ میں سختی سے برتا گیا، صحابہ جیسے عادل و صادق حضرات کے معاملہ میں سند اور تحقیق سند کی چنداں ضرورت نہ تھی اور اسی طرح بہت حد تک تابعین عظام کے معاملہ میں بھی مگر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی روایات منسوب کی جانے لگیں جن کے متعلق آنجناب نے یہ پیشین گوئی فرمائی تھی:

سیکون فی اخرا متی
اناس یحد ثونکم بما لم
تسمعو ا انتم ولا ابائکم
فایاکم وایا ہم لہ
میری امت کے آخری زمانے میں کچھ
ایسے لوگ ہوں گے جو تم سے ایسی ایسی
چیزیں بیان کریں گے جنہیں نہ تم نے کبھی
سنا ہوگا اور نہ تمہارے آباء و اجداد نے تم
ان سے سنا کر رہنا۔

تو اسناد کی تحقیق کا طریقہ کار وضع کیا گیا۔ ابن سیرین فرماتے ہیں ”پہلے دور میں لوگ اسناد کے بارے میں نہیں پوچھتے تھے مگر جب فتنہ پیدا ہونے لگا تو لوگ اسناد کے بارے میں تفتیش کرنے لگے۔“
عبداللہ بن مبارک نے فرمایا:

الاسناد من الدین
لو لا الاسناد لقال من شاء
ما شاء
علم الاسناد دین کا حصہ ہے۔ اگر
یہ علم نہ ہوتا تو ہر شخص کو کھلی چھوٹ ہوتی
کہ جو چاہے کہے۔

چنانچہ محدثین نے خبر واحد کو قبول کرنے کے لیے راویوں کے لیے حسب ذیل شرطیں قرار دیں۔
عقل ضبط عدالت اور اسلام۔ شافعی اصولیین نے مکلف ہونے

۱۔ مسلم، مقدمہ، باب انہی عن الروایۃ عن الضعفاء۔۔۔۔۔

۲۔ خطیب بنخلی کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۱۶۲ طبع حیدرآباد ۱۳۹۰ھ

۳۔ معرفۃ علوم الحدیث ص ۶۰ دارالکتب المصریۃ ۱۳۹۶ھ

کی شرط کا اضافہ کیا ہے مگر تمام علماء کے نزدیک یہ عقل ہی میں شامل ہے۔ خبر واحد کی صحت قطعیت اور حجیت کے سلسلہ میں علماء کے رویے مختلف رہے ہیں اور کسی قدر افراط و تفریط کا مظاہرہ بھی کیا گیا ہے۔ ایک طبقہ نے اسے غیر یقینی اور ظنی الثبوت کہہ کر دین کے بڑے حصے کو غیر قطعی بنا دیا اور دوسرے طبقہ نے اس کے منکرین کو کافروں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ خبر واحد کے سلسلے میں معتدل رویہ اور سنت متوازہ کے درجہ کی نہیں ہے اس لیے منکرین کو کافر نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ وہ دین میں حجت ہیں۔

متابعات، شواہد اور اطراف

محدثین کے طریقہ تحقیق میں خبر واحد کو قطعی الثبوت اور واجب العمل کے مقام تک پہنچانے کے لیے متابعات و شواہد کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان حفرات نے یہ کوشش کی ہے کہ ایک روایت جتنے لوگوں سے مروی ہو ان سب سے ہر امکان حدیث شی جائے ایک ہی روایت جب متعدد طریقوں سے بیان کی جاتی ہے تو اس کی صحت اور قوت میں اضافہ ہو جاتا ہے اس لیے محدثین اور رواۃ نے لمبے لمبے اسفار بھی کیے، بعد میں متابعات و شواہد جمع کرنے کا رجحان عام ہوتا گیا۔ چنانچہ ایک مشہور حدیث ’انما الاعمال بالنیات‘ سات سو طریقوں سے مروی ہے۔ امام مسلم اور امام ترمذی کے طریقہ تحقیق میں اس کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ کتب حدیث میں ایک روایت کہیں اجمالاً آتی ہے اور دوسری جگہ تفصیل سے کہیں حدیث کا ترجمہ الباب کی مناسبت سے بیان کیا جاتا ہے اور دوسری جگہ دوسرا حصہ یا تمام حصہ، مختلف مقامات پر ایک حدیث کے جتنے پہلو ہوتے ہیں ان کو جمع کرنا ’اطراف‘ میں شامل ہے۔ محدثین کی یہ کوشش روایت یعنی سند کی جانچ کے لیے بھی معاون ہوتی ہے اور متن کی تحقیق میں تو سب سے زیادہ کارگر ہوتی ہے اسی لیے روایت کی تحقیق کے لیے ’کتب اطراف‘ کا جاننا از حد ضروری سمجھا گیا ہے۔

روایات احکام میں اسناد کی سختی

حدیث کی آئینی اور تشریعی حیثیت کے پیش نظر محدثین نے احکام اور فضائل کی روایات میں قدرے فرق و امتیاز سے کام لیا ہے، احکام و مسائل، معاملات و عقائد وغیرہ کے باب میں جو روایات آئیں محدثین نے ان کی اسناد کی تحقیق و تنقید میں سختی سے کام لیا مگر فضائل کے باب میں کسی قدر نرمی سے کام لیا کیونکہ اس کا تعلق کسی معاملہ کی حلت و حرمت سے نہیں ہوتا چنانچہ احمد بن حنبل فرماتے ہیں ”جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حلال و حرام اور سنن و احکام سے متعلق حدیث روایت کرتے ہیں تو اسناد میں سختی برتتے ہیں اور جب فضائل اعمال سے متعلق روایت کرتے ہیں تو اسناد میں نرمی اختیار کرتے ہیں۔“

اس کا یہ مطلب نہیں کہ فضائل کے باب میں ہر طرح کی روایات قابل قبول اور قابل اشاعت ہیں۔ جہاں تک موضوع روایات کا تعلق ہے محدثین نے ان کی روایت کو قطعی حرام قرار دیا ہے خواہ ان کا تعلق اعمال سے ہو یا فضائل اعمال سے، البتہ ضعیف روایات کے سلسلہ میں محدثین کے دُکُورہ پائے جاتے ہیں ایک گروہ کے نزدیک ضعیف روایات قبول ہی نہیں کی جاسکتی ہیں حتیٰ کہ فضائل میں بھی نہیں قبول کی جاسکتی۔ ابو بکر ابن عربی وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ دوسرے محدثین نے اگرچہ فضائل کے باب میں ان کو گوارہ کیا ہے مگر وہ کچھ شرطیں عائد کرتے ہیں۔

- (۱) شدید ضعف نہ ہو۔ (۲) کوئی مسئلہ (اصل شرعی) ثابت نہ کیا جائے۔
- (۳) روایت کا ضعیف ہونا بیان کر یا جائے اور روایات پر عمل کرتے وقت صحیح حدیث سمجھ کر عمل نہ کیا جائے بلکہ احتیاط ملحوظ رہے۔
- (۴) ضعیف روایات کبھی درج نہ ہوں اور کبھی موضوع بھی ثابت ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر اس ضعیف کو بھی پہنچ جاتی ہیں اور کبھی موضوع بھی ثابت ہوتی ہے۔ حافظ ابن حجر اس ضعیف

لے کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۱۷۸

۲۹۸ ص ۱۷ طبع مصر ۱۳۸۵ھ

۲۳۴

کو فضائل میں قبول کرتے ہیں جو درجہ حسن کی ہو۔

امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں ”شرعیات میں صرف صحیح اور حسن احادیث ہی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ ضعیف احادیث لینا روا نہیں البتہ امام احمد وغیرہ بعض علماء نے فضائل اعمال میں ضعیف احادیث کی روایت جائز رکھی ہے بشرطیکہ ان کا جھوٹ ثابت نہ ہو گیا ہو اور یہ اس بنا پر کہ جب کوئی دلیل شرعی سے ثابت ہو جائے کہ مشروع ہے اور اس کی فضیلت میں ضعیف حدیث روایت کی جائے بشرطیکہ وہ جھوٹی نہ ہو تو خیال ہوتا ہے کہ ثواب درست ہوگا۔ لیکن کسی امام نے بھی یہ نہیں کہا کہ ضعیف حدیث سے کوئی عمل بھی واجب یا مستحب قرار دیا جاسکتا ہے جو کوئی یہ کہتا ہے مخالف اجماع ہے۔“

امام ابن تیمیہ کے شاگرد اور محقق، مفسر اور محدث علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ ضعیف روایات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

لا يجوز روايتهما ۱۰ ان دونوں کی روایت ان کا ضعف

بیان ضعفہما ۱۱ بیان کیے بغیر جائز نہیں۔

محدثین کرام نے اسناد کی تحقیق میں اس قدر احتیاط ملحوظ رکھی ہے کہ اس راہ کی ایک ایک ممکنہ کمزوری کی نشاندہی کی اور اس کا حکم بیان کیا مثلاً راوی محدث بیان کرتے وقت اپنے شیخ کا نام نہ لے، راوی کسی مجہول الحال آدمی سے روایت کرے، راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات ہی نہ ہو، راوی کسی شخص کو درمیان سے چھوڑ دے۔ راوی اپنے سے ثقہ تر راوی کی مخالفت کرے۔ راوی تابعی کو چھوڑ کر براہ راست صحابی سے روایت کرے۔ تابعی صحابی کا واسطہ چھوڑ کر رسول کریم سے روایت کرے وغیرہ۔ ان سب کے بارے میں محدثین نے قطعی ضوابط بنائے۔ اس آخری کمزوری کو لیجئے کہ تابعی صحابی کو چھوڑ کر رسول کریم سے روایت کر دے اس کو اصطلاح حدیث میں ”مرسل“ کہا

۱۰ ابن تیمیہ: کتاب الوسیلہ، مترجم عبدالرزاق طبع آبادی ص ۱۳۱/۱۳۲ کیری پریس لاہور ۱۹۲۵ء

۱۱ تفسیر ابن کثیر ۱/۱۶۸ - طبع دار الفکر ۱۹۸۰ء ۲۳۷

جاتا ہے۔ حدیث مرسل عام طور پر محدثین کے نزدیک حجت نہیں، مگر امام مالک کی مراسیل اور "بلغنی" سے جو احادیث وہ ذکر کرتے ہیں ان کو وزن دیا جاتا ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ امام مالک اور بنی کریم کے درمیان واسطے بہت کم ہیں بلکہ بعض روایات صرف دو واسطوں یعنی حضرت نافع اور حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہیں اس لیے سند کو سلسلۃ الذہب کہا جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ امام مالک اہل مدینہ کے درمیان رائج شدہ عمل کو بھی سند مانتے ہیں اور اسے حدیث کی تشریح و تعبیر میں اہمیت دیتے ہیں اس طرح مرسل روایات کو دوسری راہ سے تقویت ملتی ہے انھوں نے اپنی کتاب الموطا میں تقریباً ساٹھ مرسل روایات ذکر کی ہیں۔ علامہ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ صرف چار مرسل روایات کے علاوہ تمام مراسیل کا مسند و مرفوع ہونا دوسرے طریقوں سے ثابت ہے۔^۱

سلسلہ سند کی کمزوری

سند میں سختی برتنے کے بعد بھی اس کا امکان بہر حال موجود تھا کہ کوئی بددین جھوٹی سند وضع کر کے کوئی من گھڑت روایت بیان کر دے۔ محدثین نے اس راہ کی کمزوری کا سراغ لگانے کے لیے تاریخ کا استعمال شروع کیا مثال کے طور پر ابن عمر بن معدان الکلاعی کا بیان ہے کہ عمر بن موسیٰ نامی راوی جب حمص آیا تو ہم اس کے پاس مسجد میں جمع ہوئے اس نے کہا مجھ سے روایت کی تمہارے صالح شیخ نے اور بار بار یہ جملہ دہرایا تو میں نے پوچھا کہ یہ بتاؤ کہ یہ صالح شیخ کون ہیں؟ اس نے کہا خالد بن معدان ہیں میں نے پوچھا کس سال تمہاری ملاقات ہوئی وہ بولا آرمینیا کے جہاد میں میں نے کہا شیخ اللہ سے ڈر خالد بن معدان سن ۱۱۵ میں وفات پا گئے اور تمہارا دعویٰ ہے کہ ان کی وفات کے چار سال بعد تم ان سے ملے پھر انھوں نے روم کے جہاد میں توحصہ لیا ہے آرمینیا کے جہاد میں کبھی شریک نہ ہوئے۔^۲

۱۔ مولانا محمد زکریا کاندھلوی: مقدمہ اوجز المسالک طبع لکھنؤ

۲۔ کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ ص ۱۵۸

درایت

ان تمام کوششوں کے باوجود (جو راوی کی حالت کو جاننے کے لیے کی گئیں) یہ گنجائش اب بھی رہ جاتی ہے کہ ہو سکتا ہے کہ ایک روایت سند کے معیاروں پر پوری اترتی ہو اور کہیں کوئی ضعف اور کمزوری نہ ہو مگر وہ حدیث رسولؐ نہ ہو محدثین کا زور اور ان کے اصول کا بڑا پہلو اگرچہ روایت ہی کی تحقیق پر ہے مگر انھوں نے اس کمزوری کو بھی نظر انداز نہیں کیا اور اس کی گرفت کرنے کے لیے بھی تحقیق و تنقید کی کوشاں بنائیں چنانچہ قرآن کریم میں خود روایتی معیار کے استعمال کی بنیاد رکھی مثلاً حضرت عائشہؓ پر جب منافقین اور ان کے ساتھ بعض صحابہ نے تہمت لگائی تو قرآن کریم نے اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

لَوْ اِذْ سَمِعْتُمُوهُ قُلْتُمْ
مَا يَكُونُ لَنَا اَنْ نَّتَكَلَّمَ بِهٰذَا
سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ
عَظِيمٌ (سورۃ النور: ۱۶)

کیوں نہ اسے سنتے ہی تم نے کہہ دیا
کہہیں ایسی بات زبان سے نکالنا ہی
زیب نہیں دیتا سبحان اللہ یہ تو ایک
بہتان عظیم ہے۔

اس تہمت میں بعض صحابہ بھی ملوث ہو گئے تھے اگرچہ ان کی ثقاہت کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ مگر قرآن نے توجہ دلائی کہ یہ واقعہ ناقابل تسلیم تھا تم نے پہلے ہی کیوں نہ اسے مردود ٹھہرایا۔ صحابہ کرام نے بھی اس اصول تحقیق سے استفادہ کیا۔ محدثین نے روایت کی جانچ کے لیے حسب ذیل درایتی معیار مقرر کیے اور کہا کہ ایسی روایت غیر معتبر ہے جن میں حسب ذیل عیوب میں سے کوئی ایک چیز موجود ہو:

(۱) عقل سلیم کے خلاف ہو۔ (۲) اصول مسلمہ کے خلاف ہو۔ (۳) محسوسات اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔ (۴) قرآن مجید یا حدیث متواتر یا اجماع قطعی کے خلاف ہو۔ (۵) جس حدیث میں معمولی کام پر پہے پایا یا اجرا معمولی گناہ پر عذاب الیم کی وعید ہو۔ (۶) رکیک المعنی ہو۔ (۷) راوی ایسے شخص سے روایت کرے جس سے اس کی ملاقات نہ ہو اور اس

سے کوئی روایت نہ کرتا ہو۔ (۸) ایسی روایت جس سے عام لوگوں کو واقف ہونا چاہیے مگر راوی کے علاوہ کسی نے روایت نہ کی ہو۔ (۹) ایسا واقعہ ہو جسے عوام کو جاننا چاہیے مگر صرف راوی جانتا ہو (۱۰) روایت کلیہ کے خلاف ہو (۱۱) روایت میں کسی قوم یا طبقہ کی مذمت ہو (۱۲) کسی پیشہ یا صنعت کی مذمت ہو۔ (۱۳) نام، تاریخ اور مقام کے تعین کے ساتھ پیشین گوئی ہو (۱۴) شان نبوت کے منافی ہو (۱۵) شان خداوندی کے منافی ہو وغیرہ۔

علامہ ابن الجوزی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ”ہر وہ روایت جو عقل کے منافی، قرآن و سنت کے مخالف اور اصول سے متناقض ہو تو اسے سمجھو کہ وہ غیر معتبر ہے۔“ مگر درایتی معیار بیان کرنا جتنا آسان ہے اس کو بروئے کار لانا اور حدیث کی تحقیق و تخریج میں اس کو بنیاد بنانا اتنا ہی مشکل ہے۔ یہ تمام اصول اگر ایک اہل علم کو برتنے لیے دے دئے جائیں تو وہ صحیح احادیث کے بیشتر ذخیرہ کو نامعتبر قرار دے گا کیونکہ اس کے فہم کے مطابق کوئی نہ کوئی روایت کسی معیار پر پوری نہ اتر رہی ہوگی سچی بات تو یہ ہے کہ اسما، الرجال کی طرح درایت کے استعمال کے لیے بھی حدیث کے فن میں مہارت اور طویل ممارست لازم ہے۔

علامہ ابن قیم الجوزیہ سے جب یہ سوال کیا گیا کہ کیا صرف درایت کی بنیاد پر کسی روایت کو موقوف قرار دیا جاسکتا ہے؟ تو انھوں نے جواب دیا: ”یہ بڑا اہم سوال ہے یہ وہی شخص جان سکتا ہے جو سنن پر حاوی ہو اور اس کے خون اور گوشت میں وہ مخلوط ہوگئی ہوں اور ان پر اسے ملکہ حاصل ہو گیا ہو۔ سنن اور آثار کو پہچاننے میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو پہچاننے میں، رسول کریم کے اوامر و نواہی، دعوت و خبر، پسند و ناپسند اور تعلیم و تربیت سب جان لینے میں اسے اختصا ص اور مہارت حاصل ہوگئی ہو، گویا وہ حضور کے ساتھ صحابہ کرام سے ملا ہوا ہے اس قسم کا انسان آنحضرت کے افعال و احوال اور اقوال کو جان سکتا ہے۔“

۱۔ دیکھئے ابن قیم کی المنار المنیف، طبع حلب ۱۹۸۹ء اور دلائل قاری کی موضوعات کبیر طبع مصر ۱۲۸۹ھ

۲۔ المنار المنیف ص ۴۴

درایت کی بنیاد پر صحیح السند حدیث بھی رد کی جاسکتی ہے۔ اس کی ایک مثال حدیث زہرہ ہے جسے علامہ ابن جریر طبری نے اپنی سند سے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؑ نے فرمایا زہرہ ایک خوبصورت عورت تھی جو ایران کی رہنے والی تھی وہ اپنا مقدمہ دو فرشتوں ہاروت و ماروت کے پاس لے گئی تو ان دونوں نے اس عورت کو بکامیابی کے لیے بہکایا تو عورت نے کہا یہ اسی وقت ممکن ہے کہ تم لوگ وہ کلمہ مجھے سکھا دو جس کو پڑھ کر آسمان پر چڑھ جاتے ہیں ان دونوں نے وہ کلمہ اسے سکھا دیا اور وہ اسے پڑھ کر آسمان پر چڑھ گئی اور اسے ستارہ زہرہ بنا دیا گیا۔ اس روایت پر نقد کرتے ہوئے علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

”وهذا الاسناد وبالحققات
وهو غريب جدا“^۱ اس سند کے لوگ تو ثقہ ہیں مگر روایت انتہائی غریب ہے۔

تحقیق و تخریج اور تنقید حدیث میں روایت و درایت کا اہم پہلو یہ دیکھنا بھی ہوتا ہے کہ راوی نے جو واقعہ بیان کیا ہے یا جو قول نقل کیا ہے وہ کس حد تک واقعی اور حضورؐ کی منشا و مقصد کے مطابق ہے اور کس حد تک راوی کا اپنا تاثر اور طرز تعبیر اس میں شامل ہے۔ کبھی واقعہ تھوڑا ہوتا ہے مگر اس کی روایت میں راوی کا تاثر و طرز بیان اس طرح شامل ہو جاتا ہے کہ واقعہ کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ ایک موقع پر جب بنی اکرمؓ نے اپنی ازواج مطہرات سے علیحدگی اختیار کی تو صحابہ کرامؓ میں یہ خبر عام ہو گئی کہ آپؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے حضرت عمرؓ سے کہیں کہیں نبیؐ میں آئے تو صحابہ جمع تھے اور اس واقعہ سے پریشان تھے۔ حضرت عمرؓ بنی اکرمؓ کے پاس گئے اور صحیح صورت حال دریافت کی تو آپؐ نے طلاق دینے کی خبر کو غلط بتایا۔

محدثین اور اصولیین کے یہاں تحقیق حدیث میں ایک اور معاملہ انتہائی اہم ہے اور بڑا نازک بھی ہے وہ یہ ہے کہ کبھی روایات میں اختلاف اور تعارض کی شکل پیدا ہو جاتی ہے اگرچہ احادیث میں اختلاف و تعارض کم ہے لیکن کچھ روایات ایسی ضرور آتی ہیں جن میں یہ صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس معاملہ میں اصولیین نے الگ الگ منہاج قائم کیے ہیں۔

جب ایک سے زیادہ روایات باہم متعارض ہوں تو امام ابو حنیفہ قدر مشترک نکالنے پر زور دیتے ہیں اور یہ بھی مشکل ہو تو پھر علی روایت کو ترجیح دیتے ہیں اور یہ بھی مشکل ہو تو وہ روایت قابل ترجیح ہوتی ہے جس کا راوی فقیہ ہو۔ مثلاً عمر بن دینار نے جابر بن زید ابو الشغائر سے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالت احرام حضرت میمونہؓ سے شادی کی تھی۔ عمرو بن دینار نے جابر بن زید سے کہا کہ ابن شہاب زہری نے مجھے بتایا ہے کہ زید بن الاصم نے کہا کہ نبی اکرمؐ نے حضرت میمونہؓ سے جب شادی کی تھی اس وقت آپ حالت احرام میں نہیں تھے جابر بن زید نے جواب میں کہا کہ حضرت میمونہ ابن عباس کی خالہ تھیں ان کے حالات سے وہ زیادہ باخبر تھے تو عمر بن دینار نے اس کا جواب دیا کہ حضرت میمونہ زید بن الاصم کی بھی خالہ تھیں اس پر جابر نے کہا ”زید بن الاصم جو پیشاب کرنے میں احتیاط نہیں ملحوظ رکھتے تھے ان کا ابن عباس سے کیا مقابلہ؟“

امام مالک متعارض و اختلاف روایات کی صورت میں تعامل اہل مدینہ کو اہمیت دیتے ہیں اور اس کی بنیاد پر کسی روایت کو ترجیح دیتے ہیں۔

امام شافعی ”مجمعی الباب“ کی ترجیح کے قائل ہیں۔ یعنی وہ باعتبار سند امام اور قوی روایت کو قبول کرتے ہیں اور امام احمد بن حنبل اس صورت میں اسلاف کے عمل کو حجت مان کر ترجیح و انتخاب کا معاملہ کرتے ہیں۔ ان مناج سے حدیث کی تحقیق میں بھی کئی امسائل کے استخراج و استنباط میں بھی مدد ملتی ہے۔

آخر میں محدثین اور سیرت نگاروں کے مناج تحقیق کے درمیان فرق بیان کر دینا مناسب ہے۔ اصحاب حدیث کا مقصود بالذات احکام و مسائل کو جاننا ہوتا ہے اور رسول کریمؐ کی ذات گرامی سے ان کی بحث ضمنائاً التزاماً ہوتی ہے اور اصحاب سیرت کا مقصود بالذات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے واقفیت فراہم کرنا ہوتا ہے اور احکام و مسائل سے ان کی بحث ضمنائاً ہوتی ہے محدثین رواۃ کی ثقاہت۔ عدل، تقویٰ اور دیانت کی کمی و زیادتی کی بنا پر روایتوں میں اختلاف کے وقت مقبول روایتوں کو ترجیح دیتے ہیں اور اصحاب سیرت حالات کی موافقت اور واقعات کے علم کی بنا پر ترجیح دیتے ہیں اور جب قوی اور علی روایات میں اختلافات

نظر آئے تو اصولیین قولی روایت کو علمی روایت پر ترجیح دیتے ہیں۔
 علمِ حدیث میں علمِ اسماء الرجال اور فنِ جرح و تعدیل کے ضوابط کی تعیین سے
 دوسرے علوم میں تنقید و تحقیق کی راہ آسان ہوتی ہے۔ علمِ حدیث کے ان بے مثال
 اصولوں سے علمِ الانسان، علمِ العمران اور علمِ الاجتماع ہر جگہ استفادہ کیا جاسکتا ہے
 علامہ شمس الدین ذہبی کی میزان الاعتدال فی تقدیر الرجال، علامہ ابن اثیر جزیری کی جامع
 الاصول، حافظ ابن حجر عسقلانی کی تہذیب التہذیب، تقریب التہذیب اور سان المیزان
 حافظ منذری کی تذکرۃ الحفاظ وغیرہ اس فن کی متداول کتابیں ہیں جن کو نہایت کتب کہا جاسکتا ہے۔

صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات

از

مولانا سید جلال الدین عمری

اسلام نے حفظانِ صحت پر کس قدر زور دیا ہے؟ اور طہارت و نظافت، غذا
 کے صحیح استعمال، کھانے پینے کے آداب اور جسمانی ورزش کو کتنی اہمیت دی ہے؟
 علاج کو شریعت کس قدر سے دیکھتی ہے؟ کیا وقت ضرورتِ محرمات سے علاج ہو سکتا ہے؟
 خودکشی اور قطعِ حیات کیوں منع ہے؟ روحانی علاج کیا ہے اور اس کے کیا فائدے ہیں؟ مرض کی
 عیادت اور خدمت کا دین میں کیا مقام ہے؟ اس کتاب میں ان پر اور ان جیسے دیگر اہم عصری
 مسائل پر معروف محقق مولانا سید جلال الدین عمری نے سیر حاصل اور مدلل بحث کی ہے۔
 اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی مفصل کتاب جو عوام و خواص کے علاوہ مسلم طبیوں
 اور ڈاکٹروں کے لیے بھی مفید ہے۔

آفینٹ کی حسین طباعت۔ عمدہ کاغذ، دیدہ زیب ٹائٹل صفحات : ۳۸۸

قیمت مجلد : ۴۰/-

ملنے کے پتے : (۱) مکتبہ تحقیق و تصنیف اسلامی۔ بیان والی کوٹھی، دودھ پور، علی گڑھ

(۲) مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔ دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامونگر، دہلی ۱۱۰۰۱۹